(1)

DEPARTMENT OF URDU

Langat Singh College, Muzaffarpur

NAAC Grade – 'A'

(A Constituent unit of B.R.A. Bihar University, Muzaffarpur)

DR. MUSTAFIZ AHAD
Assistant Professor
Mob- 9955722260, 9472079131

Email:- ahadmustafiz@gmail.com
lscollegeprincipal@gmail.com

Ref. No:.....................

Date :.........................

B.A. Part I Urdu (Hons)

Paper I

Topic:- Qaseeda &

Zauq ki Qaseeda negari

Ahad
14/7/20

B.A. (Hon) Part I
Paper – I

ڈاکٹر مستفیض احمد
شعبۂ اردو
ایل ایس کالج مظفرپور

شیخ محمد ابراہیم علی ذوق۔

پیدائش۔ 1789 ـ وفات 1854

A. اردو میں قصیدہ نگاری

B. ذوق بحیثیت قصیدہ گو

← تعارف
← فن قصیدہ نگاری
← قصیدہ کی قسمیں
← قصیدہ کے اجزائے ترکیبی
← اردو میں قصیدہ نگاری کی روایت
← اردو کے قصیدہ نگار شعراء
← اردو قصیدہ نگاری میں ذوق کی اہمیت
← ذوق کے معاصر قصیدہ نگار شعراء۔

← ذوق کا تعارف
← ذوق کا عہد
← ذوق کی شاعری
← ذوق کے معاصرین

معاون کتابیں

اردو میں قصیدہ نگاری۔ – اصناف ادب اردو
– تاریخ ادب اردو
– نقیس شعر و ادب
– ذوق دہلوی
– انتخاب قصائد ذوق

B.A.(H) Part-I
P.I

ڈاکٹر مستفیض احد

"کلیات ذوق"

اردو قصیدہ نگاری میں ذوق کی اہمیت

تعارف:-
اردو شاعری میں اب قصیدہ کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے۔ عہد سلاطین میں قصیدہ گوئی کے بغیر کوئی شاعر مستند نہیں مانا جاتا تھا۔ بادشاہ، نواب اور امیر لوگوں نے اس شعری صنف کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ لفظ "قصیدہ" قصد سے نکلا ہے جس کے معنی قصد کرنے کے ہیں یعنی اسے ارادہ بھی کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں مدح کرنے کو قصیدہ کہتے ہیں۔ ارباب ادب کے نزدیک قصیدہ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی کی مدح یعنی تعریف کی جائے یا کسی کی ہجو یعنی برائی کی جائے۔

قصیدہ کا فن:
غزل کی طرح قصیدہ کا پہلا شعر بھی مطلع کہلاتا ہے اور اس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ و ردیف ہوتا ہے بعض قصیدے بغیر ردیف کے ہوتے ہیں۔ باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ و ردیف یا صرف قافیہ ہوتا ہے۔ غزل ہی کی طرح قصیدے میں مقطع بھی ہوتا ہے لیکن قصیدے میں کچھ چیزیں غزل سے مختلف بھی ہیں مثلاً درمیان میں کئی مطلعے ہو سکتے ہیں اور مقطع ضروری نہیں کہ قصیدے کا آخری شعر ہو۔

قصیدے کی اقسام!
قصیدے کی دو قسمیں ہوتی ہیں، خطابیہ اور تمہیدیہ۔ خطابیہ قصیدہ وہ ہے جس میں شاعر تمہید باندھے بغیر مدعا بیان کر دے۔ مطلب یہ کہ اگر قصیدہ مدحیہ ہے تو شاعر ممدوح کو خطاب کرے اور اس کے اوصاف کو بیان کرنا شروع کر دے۔ ہجو ہے تو براہ راست اس کی مذمت کرنے لگے اصل مدعا وعظ و نصیحت ہے تو بلا کسی تمہید کے اس کا آغاز ہو جائے۔
تمہیدیہ قصیدہ وہ ہے جس میں اصل مدعا سے پہلے تمہید باندھی جائے جو مدعا

بیان کیا جائے یہ تمہید یہ تشبیب کہلاتی ہے۔ اور بہار و خزاں، حسن و عشق اور پند و نصیحت کے مضامین پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اسی کی رعایت سے قصیدے کو بہاریہ، عشقیہ، وعظیہ کہا جا سکتا ہے۔

قصیدے کے اجزائے ترکیبی:

قصیدے کے عموماً پانچ اجزا ہوتے ہیں۔ تشبیب، گریز، مدح، مدعا اور دعا۔

1- **تشبیب:** قصیدے کی تمہید کو تشبیب یا نسیب کہتے ہیں۔ تشبیب کے موضوعات مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس میں شباب و شراب کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ مناظر کی منظر کشی کی جا سکتی ہے۔ تشبیب میں خود ستائی یعنی اپنے اوصاف بیان کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تشبیب پند و نصائح پر مشتمل ہو یا اس میں بے ثباتی دنیا کا بیان ہو۔ غرض یہ کہ تشبیب کے موضوعات لامحدود ہیں۔ تشبیب کو قصیدے کا سب سے اہم حصہ خیال کیا جاتا ہے۔ اسی لئے شاعروں نے اس پر بہت محنت صرف کی ہے۔ غالب کو بھی تشبیب پر بڑا ناز تھا۔ انہوں نے بہادر شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب بہت دلکش ہے۔ پہلی تاریخ کا چاند انہیں ایسا لگتا ہے جیسے کوئی شخص تسلیم بجا لانے کو جھکا ہوا ہے۔ شاعر سوال کرتا ہے کہ اے نئے چاند! یہ بتا کہ تو جھک کر کسے سلام کر رہا ہے۔

ہاں مہ نو! سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

2- **گریز:**

تشبیب کے بعد شاعر مدح کی طرف قدم بڑھاتا ہے وہ براہ راست مدح شروع نہیں کرتا بلکہ بات سے بات پیدا کر کے مدح کی طرف آ جاتا ہے۔ اس بات سے بات پیدا کرنے کو گریز کہتے ہیں۔ غالب کے قصیدے سے تشبیب کی جو مثال اوپر پیش کی جا چکی اس میں شاعر پوچھتا ہے کہ اے مہ نو! تو کس کو جھک کر سلام کر رہا ہے، جواب نہیں ملتا تو کہتا ہے کہ تو اس کا نام نہیں جانتا تو لے میں بتاتا ہوں۔ وہ داتا ہمارا بہادر شاہ ہے۔

P.T.O

B.A-P-I(H) (5)

مثلاً

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن

نام شاہنشاہ بلند مقام

قبلۂ جان و دل بہادر شاہ

مظہرِ ذوالجلال والاکرام

یہ گریز کی مثال ہوئی۔

3۔ مدح :- اس کے بعد شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرتا ہے اور اس میں خوب مبالغے سے کام لیتا ہے۔ یہی قصیدے کی خوبی ہے۔ قصیدے میں اور خاص طور پر مدح کے حصے میں شاعر پُر شکوہ الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے مدح میں زور پیدا ہوتا ہے۔ مدح کی مثال ملاحظہ ہو۔

شہسوار طریقۂ انصاف | نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر قول صورت اعجاز | جس کا ہر فعل معنی الہام

4۔ مدعا :- قصیدے کا چوتھا جزو مدعا یا عرض مطلب ہے یعنی مدح گوئی کے بعد قصیدہ نگار اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ جیسے غالب نے ایک قطعے میں اپنی مالی مشکلات بیان کرنے کے بعد کہا ہے۔

میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ | تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

لیکن یہ قصیدے کا لازمی جزو نہیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر قصیدے میں شاعر اپنا مدعا بیان کرے

5۔ دعا :- قصیدے کا آخری جزو دعا ہے۔ یعنی شاعر اپنے ممدوح کو درازیٔ عمر یا بلندیٔ اقبال وغیرہ کی دعا دے کر قصیدہ ختم کر دیتا ہے۔ جیسے غالب نے اپنے قصیدے میں بہادر شاہ کو دعا دی کہ تمہاری سلطنت قیامت تک باقی رہے

P.T.O

اردو قصیدہ نگاری

صنف قصیدہ اردو شاعری کا اہم اور مقبول حصہ ہے کیونکہ مشرقی شاعری
شاعری قصیدہ نگاری میں عروج پر ہوتا ہے۔ یہ صنف سرزمین عرب میں جنم لیا اور
وہاں بے حد مقبول ہوا۔ قبیلہ، خاندان، حسب و نسب اور شجاعت وغیرہ کی
برتری کی وجہ یہ صنف پروان چڑھا۔ قدیم شعرائے عرب نے قصیدہ گوئی کو خوشامد
اور کاروباری یعنی اپنا کام نکالنے اور انعام پانے کیلئے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ
اس کی بنیاد حقیقت پر مبنی تعریف تھی۔ اس تعلق سے عرب شعرا قصیدے میں
اپنے قبیلے، اپنے گاؤں، کسی بزرگ یا اپنے محبوب کی تعریف بغیر کسی غرض کے
بصد خلوص کرتے تھے۔ اس وقت قصیدے میں جھوٹ اور مبالغہ کا بھی گذر نہ تھا۔
اس لئے قصیدہ نگار جو کچھ لکھتا تھا سننے اور پڑھنے والے اس پر یقین کرتے تھے
لیکن آگے چل کر یہ صورت نہ رہی اور شاعر اسے حصول مطلب کیلئے استعمال کرنے لگے
عرب سے یہ صنف ایران پہنچی۔ وہاں کی مخصوص تہذیب نے اسے متاثر کیا۔
نتیجہ یہ کہ قصیدے میں تصنع، بناوٹ، مبالغہ آرائی اور جھوٹ کا دور دورہ ہو گیا۔
فارسی کے بلند پایہ شاعروں نے قصیدے کی طرف توجہ کی اور اسے بہت فروغ دیا۔
لیکن قصیدہ اُس مصلحت کا شکار ہو چکا تھا اور اسے کام نکالنے کیلئے
استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اردو میں قصیدہ نگاری کی شروعات دکن سے
ہوئی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے 1611ء کے قریب قصیدے لکھے۔ ان
قصائد کی زبان کو دکنی اردو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں دکنی الفاظ کی کثرت ہے۔ دکن
کے قصیدہ گو شعرا میں نصرتی کا نام بھی اہم ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں
سودا نے قصیدہ گوئی میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس صنف سے ان کی طبیعت کو
خاص مناسبت تھی۔ انہوں نے نعتیہ اور ہجویہ قصائد بھی لکھے اور خوب شہرت
بھی کمائی۔ قصیدہ نگاری کیلئے جو چیزیں ضروری ہیں مثلاً زور بیان، شوکت
الفاظ، مضمون آفرینی، پرکشش تشبیب، دلچسپ گریز، پرجوش انداز، اور
مبالغہ آمیز مدح، وہ سب سودا کے قصیدوں میں موجود ہے۔
لکھنؤ میں مصحفی، انشاء نے بھی بہت سے قصیدے لکھے لیکن عہد سودا
کے بعد قصیدہ نگاری کا دوسرا اہم دور مومن، ذوق، اور غالب کا زمانہ ہے۔

مومن کسی دربار سے وابستہ نہ تھے نہ انعام و اکرام کے طلبگار تھے لیکن اظہارِ شکر کے طور پر انہوں نے بھی قصیدے کہے۔ غالب نے کئی قصیدے لکھے اور اس میدان میں بھی اپنا مرتبہ سب سے منفرد رکھا۔ قصیدہ نگاری میں ان کی توجہ مدح سے زیادہ تشبیب پر رہی ہے۔ غالب کے قصیدے اپنا انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔ لیکن اس عہد کے سب سے اہم قصیدہ گو ذوق ہیں۔ ان کے قصیدے گہرا علمی رنگ لئے ہوئے ہیں اور ان میں اصطلاحات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ بعد کے قصیدہ نگاروں میں محسن کاکوروی نعتیہ قصیدہ گوئی کے طور پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئے لیکن شیخ ابراہیم ذوق کی بات ہی کچھ اور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذوق کے بعد کوئی ایسا قصیدہ نگار پیدا نہیں ہوا جس کا نام قابلِ ذکر ہو۔

شیخ ابراہیم ذوق :

محمد ابراہیم نام اور ذوق تخلص تھا۔ استادوں کے استاد تھے اس لئے انکا نام خاص حصہ میں گیا۔ ایک مدت تک بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے۔ یوں کہیں کہ عمر کے آخری لمحہ تک بہادر شاہ ظفر کے استاد رہے۔ والد کا نام محمد رمضان تھا جو فوج میں سپاہی تھے۔ 1789ء میں ذوق دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شہر کے مشہور استاد حافظ غلام رسول کے یہاں ہوا۔ حافظ صاحب شاعر بھی تھے۔ ان کے یہاں ہر وقت شعر و سخن کی محفل گرم رہتی تھی۔ اس ماحول نے ذوق پر اثر کیا اور کم عمری میں ہی شعر کہنے لگے۔ پہلے اپنا کلام حافظ صاحب کو دکھاتے پھر شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے اور انہیں کا رنگِ سخن اختیار کیا۔ بعد میں ان سے علیحدہ ہو کر اردو شاعری میں منفرد مقام حاصل کیا۔ چنانچہ دبستانِ دہلی کے دوسرے عہد کے شاعروں میں ذوق کا مقام مسلّم سمجھا جاتا ہے۔ انکے معاصرین اسد اللہ خان غالب، حکیم مومن خان مومن، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، شاہ نصیر وغیرہ خاص ہیں۔ یہ لوگ غزل کے اچھے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ چند قصائد کی بنیاد پر غالب کو قصیدہ گوئی کی حیثیت سے بھی جانا گیا ہے۔ ذوق نے تمام اصنافِ سخن قطعہ، رباعی، غزل اور قصیدہ گوئی میں اعتبار

ذوق کی قصیدہ گوئی
احترام حاصل کیا۔

ارباب ادب کے نزدیک اردو قصیدہ نگاری میں سودا کے بعد اردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ذوق ہی ہے۔ ذوق کے یہاں حمدوں اور منقبتوں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن ذوق نے ان موضوعات پر صرف ایک یا دو قصیدے لکھے ہیں۔ ایک قصیدے کے علاوہ ان کے تمام قصیدے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔

بقول محمد حسین آزاد " ذوق نے مدح کو ایسی اونچی محراب پر سجایا ہے کہ جہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ انوری، ظہوری، عرفی، فارسی کے آسمان پر بجلی بن کر چمکے ہیں لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی گرج چمک سے سننے والوں کو آسمان [illegible] کر دکھایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوق کے قصیدوں میں جو حسن بیان، شکوہ الفاظ، خوبی بیان کا جو شکوہ اور استادانہ فن کاری ہے ذوق کے بعد کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکی ہے۔

قصیدہ کی کامیابی کی قدر و معیار کے حوالے سے ذوق اردو کے بہت ہی معزز و ممتاز قصیدہ نگار ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ذوق فن قصیدہ نگاری میں سودا کے خوشہ چیں ہیں لیکن دونوں کے قصیدوں کا تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ذوق کا اپنا الگ ایک رنگ ہے۔

ذوق کا علمی مطالعہ سودا سے کچھ زیادہ وسیع تھا اس لئے ان کے قصیدوں میں علمی اصطلاحیں اور مختلف علوم و فنون کے معلوماتی سلسلے بڑے پرزور انداز سے آئے ہیں۔ ان سے قابل اعتنا فکر و فلسفہ کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ذوق ان اصطلاحوں کا صحیح استعمال کر جاتے۔ ان کے ابتدائی عہد کے قصیدوں میں بھی علم نجوم، منطق، علم طب اور معانی و بیان کی تلمیحات بہت ملتی ہیں۔

اپنے ابتدائی دور کے دلچسپ نمونے میں انہوں نے ایک شوکت کا قصیدہ بھی کہا جس میں اٹھارہ شعر الگ الگ اٹھارہ زبانوں میں کہے تھے جس کا مطلع تھا

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

P.T.O

اس دوران کو اکبر شاہ ثانی کے دربار سے "خاقانی ہند کا" خطاب عطا ہوا جو ایک بڑا علمی اعزاز تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے موقع پر انہوں نے جو شاندار قصیدہ پیش کیا اس کی ردیف "انوار سحر رنگ شفق" کو قرار دیا اس طرح کی پیچ در پیچ ردیفوں کے ساتھ غزل کہنا بھی مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ قصیدہ کہنا اور شعری و شعوری سطح پر ان تمام لوازمات کے ساتھ جو قصیدے کی فنی ضرورت اور اس کے ادبی ماحول کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایک اور قصیدہ میں جو ان کی آخری عمر کا عظیم کارنامہ ہے۔ اظہار علوم و فنون کی اصطلاحیں ان کی شعر و شاعری کی ضرورت ہی نہیں اپنی علمی عظمت کے اعتبار سے ذوق کا یہ قصیدہ اردو کے بہترین قصیدوں اور مدحیہ نظموں میں سے ہے۔ ذوق کے قصیدوں کے اکثر مطلعے دل آویز و فکر انگیز ہیں۔

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر — عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
ہیں مری آنکھوں میں اشکوں کا تماشا گوہر — اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
خجستہ مرا ساقی فرخ رخ و خورشید جمال — مرحبا مطرب بادروش فن و زہرہ خصال

غزل میں تو مطلع کے بعد حسن مطلع اور زیب مطلع بھی ہوتا ہے لیکن قصیدہ میں ایک ہی مطلع ہوتا ہے۔ بعض قصیدوں میں حسن کلام یا مدح کے سلسلہ کو طول دینے کے لئے دوسرا مطلع بھی شعرا کہا کرتے ہیں۔ ذوق کے یہاں بھی مطلع ثانی اور مطلع ثالث کی مثال مل جاتی ہے۔ اور غزل کے اشعار بھی داخل قصیدہ کرتے ہیں حالانکہ یہ روایت عام نہیں ہے۔

تشبیب ہو یا مدح ندرت فکر، جدت ادا، قوت اختراع اور تنوع مضامین ہی سے اشعار قصیدہ کی زینت بڑھتی ہے اور مبالغہ آرائی کے بغیر تو قصیدہ جیسے اپنے فطری حسن سے محروم رہتا ہے۔ قصیدہ میں بات میں سے بات اور نکتہ میں سے نکتہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ذوق کے یہاں بھی اس نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کی عمدہ مثالیں قریب قریب ہر قصیدہ میں مل جاتی ہیں۔

p. 65

(۱)

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا — تہِ دریا سے بھی جا ڈھونڈ نکالا گوہر
کورِ باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت — کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
وہ بہادر شہِ غازی کہ بہ رنگِ نیساں — روز برسائے ہے ابرِ کرم اس کا گوہر
جشن میں اس کے ہے فیض کا دریا جاری — لٹتے پھرتے ہیں بہ ہر رنگ کفِ دریا گوہر
صبحِ اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا — اس کے جو طرۂ دستار کا چمکا گوہر

~~شمیم عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں~~

(۲)

شمیمِ عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں — کہ فرشِ عنبر اگر ہے زمیں تو گرد عبیر
کرے ہے وا لبِ غنچہ دمِ ہزار سخن — چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر
کچھ انبساط ہوا ہے چمن سے دور نہیں — کہ وا ہو غنچۂ منقارِ بلبلِ تصویر
ہر ایک خار ہے گل، ہر گل ایک ساغرِ عیش — ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر

ذوق نے مدحیہ اشعار کے لئے مخمس، مربع اور رباعی کے فارم بھی اختیار کئے ہیں جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے ماسوا کسی بھی دوسرے رئیس یا صاحبِ دربار کے لئے قصیدہ نہیں لکھا۔ وہ مدح گوئی کو اپنے وقار اور درجۂ اعتبار کا قائل تھے اور اسے حصولِ زر اور طلبِ دولت کا ذریعہ سمجھ کر انہوں نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ ان کے قصیدوں میں جو علمی فضا اور ادبی ماحول ملتا ہے وہ صرف ذوق ہی نہیں ہے اس وقت کا دہلی شہر بڑے اہلِ علم اور اربابِ ادب کا مرکز تھا اور ذوق خود اس کا ایک حصہ تھے۔ انہوں نے ایک معمولی، غریب اور کم حیثیت خاندان کے ایک فرد کے طور پر اپنے دہلی کے امراء اشرف حلقوں میں جگہ بنائی اور دوسرے شہروں میں بھی ایک بڑے زبان داں اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ وہ مومن و غالب جیسے شعراء کے معاصر تھے اور اپنے زمانہ میں ان سے کہیں زیادہ بہتر سمجھے جاتے تھے ان کی شخصیت صحیح معنوں میں قلعہ اور شہر کے درمیان قدرِ مشترک کی سی حیثیت رکھتی تھی اور آج بھی ان کی زبان کو سند مانا جاتا ہے۔

Dr. Mustafiz Ahad
Assistant professor
L.S. college Muzaffarpur

"کلیاتِ ذوق" سے ماخوذ

(الف)

ہے آج یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ جوشِ نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن
گلشن سے گویا چھا گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن رشکِ چمن شانِ چمن
ہر سیم بر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق

افشاں جبیں پر سر بسر مہتاب انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نورِ سحر رنگِ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوشِ بہار و موجِ گل
دنداں پا گوہر زدہ ہیں نورِ سحر رنگِ شفق

ہر مجمع پیر و جواں اک طرفہ مشرق میکداں
روشن دل و رنگیں ادا نورِ سحر رنگِ شفق

حسنِ گلِ مہتاب نے جوشِ گلِ سیراب نے
کیا باغ میں چمکا دیا نورِ سحر رنگِ شفق

جشنِ بہادر شاہ ہے روزِ علو جاہ ہے
ہے اس لئے بہجت فضا نورِ سحر رنگِ شفق

دیکھے چمن میں برگِ گل آلودہ شبنم جو کل
خجلت سے پانی ہو گیا نورِ سحر رنگِ شفق

اک صاف مطلع میں لکھوں اور وہ سنا کر چھوڑ دوں
یوں دیکھ کر غرقِ حیا نورِ سحر رنگِ شفق

(ب)

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروئے پُرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ ہو بادہ سے کشتی طلائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہو دھند نہ ممتاز کرہ ناری و مائی

ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر کی جو زمیں پائی

سردی جو پہنچی ہے عاشق کے جگر تک
معشوق کا گرما ہے مے سے حنائی

خالی نہیں مے سے روش دانہ انگور
زاہد کا بھی ہر دانہ تسبیح ہے پانی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پر
ہر طائر تصویر کرے نغمہ سرائی

پڑھتا ہوں جو میں تیرے سامنے وہ مطلع موزوں
"احسنت" کہیں سن کے ابہائی و سنائی

(ج)

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا
مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

بھر دی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم باد بہار
بن گیا گلزار عالم رشک صد دارالشفاء

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
شاخ شکستہ کو بھی ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ پر داغ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاج دہر سے یاں تک جنوں
بعد مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں پاتی پتا

ہو گیا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا لہو
ہر رگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں
چاندنی کا پھول ہو کر ارغواں ہے بجا

نام کو اشیاء میں نہ تلخی رہی نہ سمیت
بن گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہو گیا

نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہوالشافی طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا